عبداللہ حسین کا تصوّرِ انسان (اُداس نسلیں کے تناظر میں)

سفیر حیدر، لیکچرر، شعبۂ اُردو، جی سی یونیورسٹی، لاہور

Abstract

In Abdullah Hussain's novel the continuous tradition of man's killing of man has been graphically depicted. When 'the best of creatures' falls as 'the fallen among fallen' then the animals, crying bitterly, look towards heavens with questions in their eyes. The human condition in 'Udas Nasleen' is a warning. In this article, Abdullah Hussain's idea of man has been brought under scrutiny in the context of 'Udas Nasleen'. He wants to depict the 'left humanity in human beings' on the canvass of Peaceful and free of greed society.

بقول شخصے ’’کبھی کبھی تاریخِ آدم کسی وحشی درندے کا خواب معلوم ہوتی ہے‘‘۔ عبداللہ حسین کے ناولوں میں آدم کی اسی آدم خوری کو بنیادی موضوع بنایا گیا ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ آدم نے آدم کی نسلوں کی نسلیں کس قدر اداس کر رکھی ہیں۔ نادار لوگ اپنی مفلوک الحالی کا سبب تک نہیں جان پاتے۔ قید زندگی کا متبادل لفظ بنا دیا گیا ہے منتظرِ سَحر بار بار گزرتی ہے لیکن رات اپنے اقتدار میں خود ہی اضافے کا اعلان کرتی جاتی ہے۔ یوں رات کے بعد رات ٹھہری ہوئی ہے۔ تارکینِ وطن کی واپسی کا سفر احمد مشتاق کے اس شعر کی افسانوی تفسیر ہے۔

جاتے ہوئے ہر چیز یہیں چھوڑ گیا تھا		لوٹا ہوں تو اک دھوپ کا ٹکڑا نہیں ملتا

عبداللہ حسین کو یقین ہے کہ انسان کی ساری اداسیاں' ناداریاں، پستیاں اور بنجر زندگیاں اپنے ہم جنسوں کے 'لطف وکرم' کا نتیجہ ہیں ان کے ناولوں کو پڑھتے ہوئے لی شون کی یہ بات یاد آتی ہے کہ:

"Four thousand years' history of man is history of man eating."

عبداللہ حسین نے اپنے ناولوں اور ناولٹوں میں مختلف واقعات کی پیشکش کے عمل سے اپنے تصورِ انسان کی ٹھوس، عملی اور متحرک صورت گری کی ہے۔ اداس نسلیں' میں جلیانوالہ باغ میں انسانی درندگی کو رمز اور حقیقت کی آمیزش سے بیان کیا گیا ہے۔ اور اس کے لیے بوڑھے مچھلی والے کا کردار تخلیق کیا گیا ہے۔ بقول مظفر اقبال:

This is one of the most impressive characters in Hussein's fiction. The old fisherman is a multilayer character; it is portrayed with a rich, intense, sharp, and vivid realism. His monochromatic vision has encompassed the

Indian reality _ shattered, broken, weak, and meager, but a reality nevertheless. His consciousness of his native country and of his existence is so intense that in this one character one can find most of the obsessions, Hussein was to write about in his later writtings.۱

مچھلی والے نے جو واقعات بیان کیے ہیں وہ اتنے مؤثر ہیں کہ قاری کے تجربے کا حصّہ بنتے جاتے ہیں۔ جہاں تصویر کی حد ختم ہوتی ہے وہاں تصوّر کی کربناک مسافت کا آغاز ہوتا ہے۔ اُردو ناول میں اس درجے کی پکچرائزیشن شاذ ہی مِلتی ہے۔ انسانوں کے شکار کرنے میں انسان کی مہارت دیدنی ہے۔ لوگوں میں اس طرح بھگدڑ مچتی ہے جیسے صاف پانی میں جال پھینکنے پر مچھلیوں میں دیکھی جاسکتی ہے۔ کتنا بڑا المیہ ہے کہ بندوق کی گولیاں انسان سے تیز بھاگ سکتی ہیں۔ نوجوان چہرے، آنکھیں اور ہونٹ دُنیا کی خوشنما ترین چیزیں ہیں لیکن انہیں سرد کر دیا جاتا ہے۔ اندھی گولی یہ نہیں دیکھ سکتی کہ نشانے پر جو زندگی ہے، وہ کتنی خوبصورت ہے اور یہی دلیل کافی ہے کہ وہ جینے کا حق رکھتی ہے۔ رقصِ بسمل سے آگے کی منزلیں بھی ہیں۔

''بچو! ایک وہ شخص تھا جو میرے کندھے پر ہاتھ رکھے ہوئے تھا۔ گولی لگنے پر ہوا میں اُچھلا اور وہیں ٹنگ گیا کیونکہ نیچے آنے سے پہلے چند اور گولیاں اس کے جسم میں داخل ہوئیں اور اس نے ہوا میں قلابازی کھائی اور اس طرح جب سرکس کے مسخرے کی طرح کرتب دکھانے کے بعد وہ زمین پر آیا تو کب کا مر چکا تھا۔ اس کے چہرے پر وہی جوش وخروش تھا اور وہ بدشکل نہ ہوا تھا، کیونکہ اس نے موت دیکھی ہی نہ تھی۔''۲

جلیانوالہ باغ کے سانحے کو محض تاریخ کی کتابوں میں پڑھنے والے شاید اس کربناک سطح پر انسان کشی کا نظارہ نہ کرسکیں کہ انسانوں کی چیخوں میں گولیوں کی آوازیں دب گئی ہیں۔ انسانی لاشوں کی بھرتی سے کنویں فٹ پاتھوں میں تبدیلی ہورہے ہیں اور جب لوگ ایک جگہ سے دیوار کو نیچا دیکھ کر پھاندنے کے لیے اوپر چڑھتے ہیں تو گولیاں کھا کر دیوار پر یوں لٹکے رہ جاتے ہیں جیسے کسی دھوبی نے بے شمار پاجامے اور کوٹ پتلون سوکھنے کے لیے دھوپ میں پھیلا رکھے ہوں۔

''بازار کے دونوں طرف گورے سپاہیوں کی قطاریں نشست باندھے گولی چلانے کے لیے تیار کھڑی تھیں اور بازار کے بیچوں بیچ انسانی جسموں کا ایک دریا تھا جو بہہ رہا تھا۔ وہ سب زمین پر لیٹ کر پیٹ کے بل رینگتے ہوئے پچیس گز کا وہ ٹکڑا طے کررہے تھے۔ انہیں کہنیوں یا گھٹنوں سے کام لینے کی بھی اجازت نہ تھی۔ انہیں بتایا گیا اور ہم سب کو بتایا گیا کہ ہمیں سانپ کی طرح پیٹ پر چل کر یہاں سے گذرنا ہے جہاں پر کہ ان کی عورت کے ساتھ سانپوں کا سا سلوک کیا گیا تھا اور میں نے دیکھا کہ جو کوئی بھی کہنیوں پر اٹھتا اور جو کوئی بھی گھٹنوں پر اٹھتا اُسے گولی ماردی جاتی۔ اور پھر انہوں نے ایسا کیا کہ بازار کے ایک طرف جمع

ہو کر رینگتے ہوئے جسموں سے چھ انچ اوپر اوپر گولی چلانا شروع کر دی اور جان بچانے کے لیے بھگوڑوں نے مٹی میں سر گاڑ دیے اور پاؤں کی انگلیوں اور ناخنوں سے رینگنے لگے۔۔۔۔۔۔۔۔ اس کے بعد میں اس طرف نہیں گیا لیکن میں نے دُور سے دیکھا کہ ایک مدّت تک لوگ وہاں اسی انداز میں لیٹ کر گزرتے رہے جو انسانوں کی آمد و رفت کا سخت معیوب طریقہ ہے۔''۳؎

جلیا نوالہ باغ کی قتل و غارت کی عکاسی میں اور بوڑھے مچھلی والے سردار کے ذریعے علامتی بیانیہ میں انسانی جبلّتوں کی نقاب کشائی رمزیت کے جس انداز میں کی گئی ہے اس کی کئی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ جہاں مصنّف کے تصوّرِ انسان کا ایک رُخ بغیر کسی لگی لپٹی کے سامنے آ جاتا ہے۔

''رات کو ہم آمنے سامنے بیٹھے رخشک مچھلیاں مرچوں کے ساتھ کھاتے۔ میرے باپ کو بڑھاپے کی وجہ سے کبھی کچی مچھلیاں کھانے کی عات نہ پڑ سکی۔ مجھے مزے لے لے کر مچھلیاں چباتے ہوئے دیکھ کر وہ انتہائی خفا ہوتا میں کہتا: ''بابا تم مچھیرے ہو اور مچھلی نہیں کھا سکتے۔ کیسے مچھیرے ہو!''

'چُپ رہو'تم بکتے ہو۔'' وہ کہتا

''اچھا؟ میں کہتا تو یہ لو۔' یہ کہہ کر میں لکڑی کی بالٹی میں' جس میں' مَیں مچھلیاں پالا کرتا تھا' ہاتھ ڈال کر ایک زندہ مچھلی نکالتا اور منہ میں پکڑ لیتا۔ میرے دانتوں کے درمیاں تڑپتی ہوئی مچھلی کو دیکھ کر وہ غصّے سے پاگل ہو جاتا اور ایک لمبی سی خشک مچھلی اٹھا کر میرے پیچھے دوڑتا۔ میں خشک مچھلی کے ڈر سے، جو کہ بید کی طرح لگتی ہے' باہر بھاگ جاتا اور اندھیرے میں کھڑا ہو کر اُس کی غصیلی آواز سُنتا رہتا: کیسا زمانہ آ گیا ہے۔ سانپوں اور سؤروں کے بچے انسانوں کے گھر پیدا ہونے لگے ہیں۔ ایسا کبھی سُنا تھا! زندہ مچھلی کو۔۔۔۔ زندہ آدمی کھاتا ہے۔ ایک زندگی دوسری زندگی کو۔۔۔۔''

''تم کبھی یہ اندازہ نہیں لگا سکتے کہ اس باغی شہر کو کتنی بڑی سزا ملی۔ آہ۔ باہر نکلتے ہوئے مجھے چند کُتے دکھائی دیے جو ایک مچھلی کو کھینچ رہے تھے۔ یہ وہی سفید اور چمکدار مچھلی تھی جو میں نے اس خیال سے الگ کر دی تھی کہ شاید کوئی گاہک مِل جائے۔ اس وقت اس کے ایسے انوکھے گاہک دیکھ کر مجھے بڑی ہنسی آئی۔''۴؎

جلیا نوالہ باغ کا قابیل زادہ جنرل ڈائر اپنی انسانیت کا زبردست مداح دکھایا گیا ہے۔ انسانیت کی تعریفوں کا تنوع یہاں بڑا واضح ہے۔ عبد اللہ حسین جلیا نوالہ کی بربریت کی تصویر کشی کے بعد جب اس واقعہ کے ذمہ دار جنرل ڈائر کو انکوائری بھگتنے کے موقع پر یہ کہتے ہوئے دکھاتے ہیں تو انسانیت کی شکل عجیب دھند میں لپٹی نظر آتی ہے کہ ہر شخص کے نزدیک انسانیت کا کوئی نہ کوئی درجہ ہے۔ ذاتی تعبیرِ انسانی۔

''لاہور میں میں نے ہنٹر کمیٹ کو بتایا کہ مجھ میں کتنی انسانیت ہے۔'' اس نے تیزی سے کہا' ورنہ۔''

''بالکل درست ہے۔'' دوسرے فوجی نے انگلی سیدھی کر کے کہا، ''ورنہ کون نہیں جانتا کہ کیا کچھ کیا جاسکتا تھا۔''۵؎

''میں ہندوستانیوں کے اس مقدس شہر کو جلا کر راکھ کرسکتا تھا اور ان کا طرزِ عمل دیکھ کر میرے جی میں آیا کہ اس قانون شکن اور باغی ہجوم کو نیست و نابود کر دوں اور ان کے بچوں اور ان کے گھروں کو آگ لگا دوں لیکن محض انسانی رحم و کرم اور خداترسی کے جذبے نے مجھے روک لیا۔ میں نے ایک لاقانون قوم کو زنجیروں میں جکڑ کر رکھ دیا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مجھ پر انکوائری بٹھائی گئی۔''۶؎

نعیم اور عذرا کے تعلق کی تہہ میں کئی جوار بھاٹے نظر آتے ہیں لیکن انجام بخیر ہے۔ ابتداء کی صورتحال دیکھیں تو نعیم عذرا کے طعنے کا ردِّ عمل بھی ہے اور ''اس رشتے کے تناظر میں نعیم اور عذرا وجودی کرداروں کے طور پر ابھرتے ہیں اور اکثر ان کے تعلقات کے پیچ وخم' ان کی وجودی کربنا کیوں کے ودیعت کردہ ہیں۔ اس صورتحال کی یلغار قابلِ توجہ ہے۔

''دفعتاً نعیم کو اپنے اور عذرا کے غیر فطری تعلق کا احساس ہوا اور اُسے یہ محسوس ہوا کہ ان دونوں کے آس پاس' ایک بے نام' بے وجہ خوف رینگ رہا ہے جس نے ان کی زندگیوں کو کمزور اور ناتواں بنادیا تھا کہ وہ ایک دوسرے سے الگ تنہا اور بے حقیقت وجود تھے' جو ایک مکمل' صحت مند جسم سے ٹوٹ کر جدا ہو چکے تھے' اور آہستہ آہستہ مر رہے تھے۔ دُنیا کی تمام برائیوں کو ایک ایک کر کے جمع کر رہے تھے۔''۷؎

اداس نسلیں میں برِّصغیر کا ایک وہ طبقہ ہے جس نے انسانوں کے استحصال کا 'بارِامانت' سر پر اٹھا رکھا ہے۔ وہ طبقہ اپنی اگلی نسل کی تربیت بھی خطوط پر کرنا چاہتا ہے جن پر کاربند رہتے ہوئے مزدوروں اور کسانوں کے خون پسینے کو اشرفیوں میں ڈھال کر اپنی تجوریوں کی توند میں اضافہ کرتا رہا۔ روشن آغا جیسے کردار اسی طبقۂ انسانی کے نمائندہ ہیں' لیکن اس طبقے کی نئی نسل بعض اوقات نئی تعلیم کے زیرِ اثر، زندگی کی یکسانی سے اکتاہٹ کے سبب، اپنی الگ شناخت یا تشہیر کی خواہش کے زیرِ اثر تھوڑی بہت مہم جُوئی کی بھی قائل ہے۔ 'اُداس نسلیں' میں عذرا اشرافیہ (ایلیٹ کلاس) کی اسی نسل کی نمائندہ ہے۔ عذرا اور اس کے باپ کے درمیان یہ مکالمہ دونسلوں کے مابین تفاوت کی پیشکش ہے۔

''آپ لکھنؤ میں تھیں بی بی؟''

عذرا نے گونگوں کی طرح اثبات میں سر ہلا دیا۔ روشن آغا نے چشمہ اتار کر کتاب پر رکھا اور ہتھیلیوں سے آنکھوں کو ملا۔

''ہم نے سُنا وہاں آپ نے کسی ہنگامے میں شرکت کی۔''

''میں نعیم سے ملنے گئی تھی۔'' عذرا نے یکساں آواز میں کہا۔

''نعیم نے پہلے ہی اپنی حب الوطنی سے ہماری عزّت بڑھائی ہے۔ ہمارے خاندان میں پچھلے سو برس سے کسی نے ایسے کام نہیں کیے تھے۔''

روشن آغا خفگی اور طنز سے ہنسے۔ عذرا اپنی آواز پر قابو پانے کی کوشش کرتی رہی۔

''میں نے تمہیں روشن آغا اور روشن محل کا نام برقرار رکھنے کے لیے پرورش کیا تھا۔'' روشن آغا اب واضح طور پر تلخی سے بولے ''آپ سے امیدیں وابستہ کی تھیں۔ یہ نہیں کہ چھوٹے لوگوں کی طرح آپ ہنگامے اور قانون شکنی کریں۔ اب آپ بھی جیل جاؤ گی۔''۸

اس جاگیردارانہ نوآبادیاتی نظام کی پروردہ ذہنیت کو عذرا کے ہاتھوں شکست کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ عذرا ایک آدرشی کردار کی صورت میں ناول کی سطح پر قابلِ توجہ استعارے کے طور پر بار بار ابھرتی ہے۔ مثال کے طور پر جب نعیم یہ سُنتا ہے کہ انگریزوں نے کر اس کی زمین ضبط کر لی ہے تو اس کے اس جملے کے جواب میں کہ ''اب میں غریب آدمی ہوں'' عذرا اس جملے کو اسطرح تبدیل کرتی ہے کہ ''ہاں۔ اب ہم غریب لوگ ہیں'' یہاں عذرا شیکسپیئر کے مقبولِ عام مقولے (عورت، تیرا نام کمزوری ہے۔۔۔۔) کی تردید کرتی دکھائی دیتی ہے اور عورت کے بے لوث انسانی جذبوں کی عکاس بن کر سامنے آتی ہے اور عورت کی سپردگی کی علامت کے طور پر ظاہر ہوتی ہے جہاں وہ خود کو اپنے مرد کی ذات کا ایک حصّہ متصور کرتی ہے اور آدم کی پسلی کے ساتھ جُڑت کا مظہر بن جاتی ہے۔ نعیم اور عذرا کے تعلقات کے مدّ و جزر کے کئی مناظر ناول میں دکھائے گئے ہیں اور عذرا نعیم کی نفسیاتی شخصیت کی بعض الجھنوں کے سبب بھی بنتی ہے۔ لیکن نعیم بھی جب شعور کے کسی ترقی یافتہ مرحلے میں داخل ہوتا ہے تو بے اختیار عذرا کے بطور عورت ایک اعلیٰ انسانی کردار کا اعتراف اس قدر واشگاف انداز میں کرتا ہے۔

''عذرا' میری بیوی ایک عظیم عورت ہے وہ انسان کی ساری شرافت' سارے کرب اور ساری قربانی کے ساتھ خاموشی اور رضا مندی سے زندہ ہے۔ خدا انسان کو اپنی شبیہہ میں بناتا ہے نا۔ وہ عذرا ہے۔''۹

نعیم کے شعور میں عذرا کے ساتھ رشتے کی تفہیم کا یہ دروازہ دیر سے کھلتا ہے لیکن وہ جس وجودی فیصلے پر پہنچتا ہے وہ اس کے اپنی عورت سے رشتے کے انسانی تجربے کا حاصل ہے اور کم از کم یہاں وہ نامراد ہر گز نہیں ٹھہرتا۔ اداس نسلیں میں عبداللہ حسین کا تصوّرِ انسان نعیم اور مدن کی آپس کی بحث میں بہت واضح ہو کر سامنے آتا ہے۔ طنز کے پیرائے میں بتایا گیا ہے کہ جہاں بیلوں اور آدمیوں کو کھانا ایک ہی برتن میں ملتا ہو وہاں آدمیوں کو انسان کہنا محال ہو جاتا ہے اور اس بلیغ جملے سے صورتحال کی گھمبیرتا واضح تر ہوتی ہے کہ ''انسانوں کی پگڑی سر پر ہوتی ہے' گلے میں نہیں ہوتی''۔ عزت و آبرو سے حصولِ رزق انسان کا شناختی نشان ہے۔ ذِلّت کے دسترخوان سے انسان کا بچّہ سیر ہو کر نہیں اٹھ سکتا مختصر یہ کہ یہ اعلان یہاں موجود ہے کہ جن کو کھانا صرف بیل کی ناند میں ملے وہ انسان نہیں ہیں۔

عبد اللہ حسین کے یہاں کھانا ملنے کی بحث کو جس طرح تفصیل سے اور حقیقت کے اسلوب میں رہتے ہوئے بیان کیا گیا ہے اس سے نام نہاد تہذیب یافتہ انسان کی قلعی کھُلتی نظر آتی ہے جب نعیم دلائل کے ذریعے مدن کو قائل کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ گوریلا جنگ سے بہتر ہے کہ پہاڑوں سے اُتر کر انسانوں میں شامل ہو کر ایک بڑی جنگ لڑی جائے تو مدن کا جواب کئی نسلوں کی زہریلی زندگیوں کا عطر معلوم ہوتا ہے۔ وہ سخت جھلاّ کر کہتا ہے:

''نیچے جا کر ہم پھر انہی لاکھوں کروڑوں میں مِل جائیں جن سے ہم بھاگے ہیں؟ پھر بیلوں کی طرح کام کریں تمہیں پتہ ہے وہ کتنی محنت کرتے ہیں اور انہیں کھانے کو کتنا مِلتا ہے۔ وہ کتنے گھنٹے کام کرتے ہیں اور کتنے گھنٹے سوتے ہیں۔ تم نے میرے باپ کو کھیتوں میں کام کرتے دیکھا ہے؟ یا اپنے باپ کو؟ اُن کی انگلیاں ٹیڑھی ہو گئی ہیں اور پیٹھ کی کھال دھوپ میں جل گئی ہے اور آنکھوں میں پسینہ بہہ بہہ کر وہ اندھے ہو گئے ہیں اور اُن پر اتنا قرض ہے کہ سات پُشتیں ادا نہیں کر سکتیں اور تم نے مالکوں کے مکان دیکھے ہیں اور زمینیں اور مویشی؟ اور جتنا دودھ روزانہ اُن کے گھر میں جاتا ہے اتنا تم نے ساری عمر میں بھی پیا ہے؟ تم کہاں کی بات کرتے ہو؟''[۱۰]

اسی طرح جب نعیم گوریلا جنگ کو درندگی سے تعبیر کرتا ہے تو مادھو کر جواب دیتا ہے:

''درندے بغاوت کر سکتے ہیں، بیل نہیں کر سکتے۔ ایک دفعہ میں نے ایک سرکس دیکھا تھا۔ رِنگ ماسٹر نے جب چھانٹا پٹخایا تو شیروں نے اُس پر حملہ کر دیا اور اُس کو پھاڑ ڈالا۔ کبھی بیلوں کو بھی مالکوں پر حملہ کرتے تم نے دیکھا ہے۔ وہ صرف آپس میں لڑتے ہیں کبھی کبھی بیلوں سے انسان بننے کے لیے پہلے درندے بننا پڑتا ہے۔''[۱۱]

گوریلا جنگ کی یہ پُرکشش توجیہہ ہمیں یہ بات بھی باور کراتی ہے کہ انسان ہونا فقط ایک خاص طرح کی حیاتیاتی ہئیت نہیں بلکہ یہ ایک صورتحال کا نام ہے جو کہ آزادی سے عبارت ہونا لازم ہے۔ آزادی کی یہ تلاش انسانیت کی دہلیز پر پہلا قدم رکھنے کی شرط ہے چاہے یہ قدم زندگی کے چوراہے پر لے آئے یا موت کی بند گلی میں۔ عبد اللہ حسین نے 'اداس نسلیں' میں نو آبادیاتی عہد کے انسان خصوصاً عام کسان کی کسمپرسی کی تصویر کھینچی ہے۔ غلامی کے شکنجے میں جکڑے ہوئے مقامی کسانوں کی بے بسی دیدنی ہے کبھی جبراً فوجی بھرتی کے بعد جنگی محاذوں پر بے معنی موت کی نذر ہو جاتے ہیں۔ کبھی ان محنت کشوں کے منہ سے نوالے چھین لیے جاتے ہیں اور اگر کوئی اپنے حصّے کے رزق پر اپنا حق جتانے کی گُستاخی کرے تو اس کی باقی ماندہ سانسوں کو بحقِ سرکار ضبط کر لیا جاتا ہے۔ جب اُن کی فصلیں پک کر کٹائی کے لیے تیار ہوتی ہیں تو اُن کے سروں کی فصل کاٹ دی جاتی ہے۔ نو آبادیاتی دَور میں انگریز کے دستِ راست جاگیر داروں کا عام کسانوں سے ناروا سلوک اور انسانوں کے ساتھ جانوروں جیسے برتاؤ کی مثالیں عام ملتی ہیں۔ انگریز کے مفادات اور خصوصاً مالی مفادات کے حوالے سے جاگیر داری تسلّط کی تصویریں قابل

توجہ ہیں۔

''اس کے مٹکے اناج سے بھرے ہیں اور اس نے موٹرانہ نہیں دیا۔''روشن آغا کے منشی کے سامنے پیش کیا جائے۔''، منشی نے کہا''بیل کو رسّی ڈالو''

لڑکے نے پگڑی کا ایک سرا اس کے گلے میں باندھا اور دوسرا ہاتھ میں پکڑ لیا۔''اس کے منہ میں چارہ دو''منشی نے کہا۔ ایک لڑکا خشک گھاس لا کر اس کے منہ میں ٹھونسنے لگا۔ احمد دین نے ہاتھ ہوا میں پھیلائے اور پھٹی ہوئی آواز میں چلّایا۔''نہیں نہیں''۔

اس کی باچھوں سے گھاس کے تنکے لٹک رہے تھے۔ لڑکوں نے گھاس ٹھونس کر اس کا منہ مضبوطی سے بند کر دیا۔''چلو''منشی رسّی کھینچتے۔ ہوئے بولا۔ بوڑھا کسان چوپائیوں کی طرح زمین پر چلنے لگا۔''۱۲

نوآبادیاتی دَور کے مظالم کسانوں تک محدود نہیں رہتے۔'' ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات'' کے تحت مقامی آبادی کو بنیادی انسانی سطح سے گر کر زندگی بسر کرنا پڑتی ہے۔ انسان جب آزادی کھو دیتا ہے تو اپنی تہذیبی اقدار سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتا ہے اور ستم تو یہ کہ غیر ملکی حکمرانوں کے مقامی گماشتے چاہے جاگیردار ہوں یا پولیس والے وہ غیر انسانی سطح پر اترنے والے اوّلین کردار ہوتے ہیں۔ جب'اداس نسلیں' میں بھگدڑ کے بعد علی کو تلاش کرنے والے سپاہی ایک عورت کے گھر داخل ہوتے ہیں تو یہ منظر بنتا ہے۔

''کہاں ہے؟''ایک پنجابی سپاہی نے پوچھا

''کون؟''

''تیری ماں کا یار''

ایک سکھ سپاہی نے ڈنڈا گھما کر عورت کے چوتڑوں پر مارا۔ اس نے بلبلا کر گالی دی۔

''بتا کہاں گیا؟''

''بس یہاں میں رہتی ہوں۔ مجھے پتہ نہیں۔''

عورت چوتڑ ملتے ہوئے بولی۔

''بتا رنڈی''سپاہی نے اس کے بالوں کو بازو پر لپیٹتے ہوئے کہا جب وہ پہلے کمرے میں دوبارہ پہنچتے تو سپاہی عورت کے بالوں کو سانپ کی طرح بازوں پر لپیٹے اس کی چھاتیاں مروڑ رہا تھا۔ عورت کا چہرہ کاغذ کی طرح سفید تھا۔''۱۳

صنعتی مفادات کی بھینٹ چڑھنے والے مزدور طبقے کی زندگی اس قدر بے برگ وبار ہوجاتی ہے کہ وہ زندگی کی بنیادی اور جبلّی راحتوں سے محروم ہو جاتے ہیں۔ مشینوں کی مادی برتری' اُن کی سرد بے حسی' پاگل کر دینے والی یکسانیت' لاتعلقی اور انسان دشمنی فرد کی رگ رگ نچوڑ لیتی ہے۔ پھر کونسی بغاوت؟ کہاں کی یونین؟ اور کیسی ہڑتالیں؟ 'اُداس نسلیں' میں علی اسی کُچلے ہوئے انسانی طبقے کا نمائندہ ہے' جن کی اُجرت خون خشک ہونے کے بعد بھی

اُن کے وجود کی غذا نہیں بن پاتی۔

''بیلوں کے قریب سے گزرتے ہوئے یہ دیکھ کر کہ وہ خصّی جانور تھے' اُسے رنج ہوا اور اُس نے اُن لوگوں جواس حرکت کے ذمّہ دار تھے' دل میں گالی دی۔ وہ ہمیشہ سے اُن خودغرض لوگوں کے خلاف تھا جو زیادہ کام کی خاطر بیلوں کو خصّی کروا دیتے تھے۔'' ۱۴

'اداس نسلیں' میں کھدر پوشوں کے کچلے جانے کا منظر قاری کے ذہن میں بے شمار سوالوں کو جنم دیتا ہے۔ مثلاً انسان دوسرے انسان کے وجود میں سانس لیتی زندگی سے اس حد تک لاتعلّق کیونکہ ہوسکتا ہے؟ اُسے یہ خیال کیوں نہیں آتا کہ انسان کُشی، خودکشی کی ایک شکل ہے۔ انسان، انسان کو اتنی آسانی سے کیسے بلڈوز کر دیتا ہے؟

''پیٹوں پر سے، ٹانگوں پر سے، جہاں جہاں سے بکتر بند گاڑیوں کے پہیے گزرے تھے' تین تین فٹ زمین پر لیپ ہو چکے تھے اور اُن کی سفید آنکھیں اور زبانیں باہر نکلی ہوئی تھیں۔'' ۱۵

یہ احساس بڑا واضح ہے کہ درندوں کی درندہ صفتی کی کوئی نہ کوئی حد متعین ہے لیکن انسانوں کی درندگی کی کوئی آخری منزل نہیں ہے۔ اداس نسلیں میں اس 'انسانی وصف' کو سؤروں کے شکار کے بیان میں جزئیات کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ سوار سؤروں کے ریوڑ کی تلاش میں نکلے ہوئے تھے۔ سؤر توقع سے پہلے ہی مل گئے۔ سواروں نے سُرعت سے پھیل کر نصف دائرہ بناتے ہوا اُن سیاہ، فربہ طاقتور جانوروں کو اس سمت میں ہانکنا شروع کر دیا جدھر شکاری بیٹھے ہوئے تھے۔ انسانوں کی اس مہم جوئی نے سارے جنگل میں قیامت کا شور برپا کر دیا جس سے پرندے پھڑ پھڑا کر اُڑنے لگے اور بیچارے چھوٹے چھوٹے جنگلی جانوروں میں بھگدڑ مچ گئی۔ عبداللہ حسین کے الفاظ میں یہ منظر ملاحظہ کیجیے:

''سوار اپنے نیزے سروں سے اُوپر اٹھائے چیخیں مارتے ہوئے، ادھر ادھر بھاگ نکلنے کی کوشش میں آخر کار اسی سمت میں بڑھتے جاتے تھے جدھر کو ہانکے جا رہے تھے اُس وقت انسانوں، سؤروں اور گھوڑوں کی چیخوں میں امتیاز کرنا ناممکن تھا۔'' ۱۶

جنگ اور انسان کے ازلی رشتے میں انسان کی بے بسی کا جاں گُسل احسان پہلی جنگِ عظیم میں ہلاک شدہ انسانوں کے احوال سے ہوتا ہے۔ جہاں آدمی چوہوں کی مانند مرتے ہیں۔ جنگ کے دوران انسانی جبلّت کو عبداللہ حسین نے یہ مثال دے کر واضح کیا ہے کہ سڑک پر جاتے ہوئے ہم چیونٹیوں کے ایک قافلے پر پاؤں رکھ کر گزر جاتے ہیں اور سینکڑوں چیونٹیاں ہمارے جانے بغیر رجاتی ہیں لیکن بصورت دیگر اگر اکلوتی چیونٹی ہمارے بازو پر چل رہی ہو تو اُسے مارتے ہوئے ہم ہچکچاتے ہیں' گھبراتے ہیں اور یا تو اُٹھا کر نیچے رکھ دیتے ہیں یا پھر پھونک مار کر اڑا دیتے ہیں۔ گویا جنگ میں انسان چیونٹیوں کے طرح مسلے جاتے ہیں اور صورتحال کچھ یوں ہوتی ہے۔

''اپنے مورچوں میں اور دشمنوں کے مورچوں میں اس نے ہزاروں سپاہی مرتے ہوئے دیکھے کسی کو آسانی کے ساتھ' کسی کو اینٹھ کر مرتے ہوئے، کسی کے چہرے پر سفیدی اور معصومیت

ہوتی، کسی پر موت کی نیلاہٹ اور تکلیف کسی کی آنکھیں زندہ آدمی کی طرح جھانکتی ہوتیں، کسی کی اندھے شیشوں کی مانند ماتھے میں جڑی ہوتیں، کسی کی جیب میں خشک راشن اور چند گولیاں ہوتیں۔ کسی کے پاس بچوں اور خوبصورت لڑکیوں کی تصویریں اور ان کے سیاہ بالوں کے گچھے بطور نشانی کے ہوتے اور ڈائریاں۔ وہ سب پتھروں پر، خندقوں میں، خشک جوہڑوں میں، برف پر، کیچڑ میں مرے پڑے ہوتے''۔[۱۷]

عبداللہ حسین کے یہاں انسان کی خوابیدہ انسانیت کی انگڑائی کے مناظر بھی ہیں۔ یہ عام طور پر مرکزی کرداروں کے ساتھ جُڑے بظاہر کم اہم کرداروں کے رویّوں میں دکھائے گئے ہیں۔ مثلاً 'اداس نسلیں' میں C.O. نمبر ۱۹، جس کا جیل میں اکلوتا فخر اُس کا نیا خوبصورت جوتا ہے اور جس پر وہ یوں ہاتھ پھیرتا تھا جیسے کسی بچّے کو سہلاتے ہیں اور جس جوتے کو جیل کی نالی کے سوراخ سے نکالتے ہوئے اس کے کئی چوٹیں آئی تھیں اور جو پورا سال ایک قیدی ساتھی کو اپنے پلّے سے افیم کھلاتے رہنے کے صِلے میں اُسے ملا تھا، وہی جوتا وہ رہا ہونے والے ایک نابینا جیب کُترے کو ایک لمحے میں فیصلہ کرتے ہوئے، پہنا دیتا ہے۔

''لو۔ یہ پہن لو۔'' وہ جوتا اُس کے ہاتھ میں پکڑاتے ہوئے بولا۔ اندھے نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے جوتے کو ٹٹولا اور بچوں کی طرح ہنس پڑا۔ جلد جلد اُسے پاؤں میں پہن کر اُس نے ہاتھ بڑھا کر اوورسیر کے گال میں چٹکی بھری اور باہر نکل گیا۔ C.O. نمبر ۱۹ ہنستا ہوا نعیم کی طرف آیا۔ ''میری کھوپڑی ابھی تک زخمی چوہے کی طرح دُکھ رہی ہے''۔ اُس نے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''لیکن میں نے سوچا وہ دُنیا میں جا رہا ہے اور اُس کے پاؤں میں کھُجلی ہے۔''[۱۸]

یہ کردار ان انسانوں کا نمائندہ ہے جو عملاً کسی جُرم کے ارتکاب میں مردود اور سزا یافتہ قرار دیے گئے ہیں لیکن یہ لوگ اندر سے حیرت کی حد تک انسانیت سے جُڑے ہوئے ہیں اور بے غرضی کی علامت بن کر سامنے آتے ہیں۔ یہ ان پڑھ، دہشت پسند، جیب کُترے، قیدی، مجرم کرداروں کا زندگی کے لیے اندازِ نظر ان کے کسی نہ کسی قول یا فعل سے عیاں کر دیا گیا ہے۔ ان کے بعض فیصلے، بعض حرکات ان کے باطنی انسان کے منور چہرے سے روشناس کراتے ہیں مذکورہ بالا مجرم کا نعیم کے ساتھ جیل میں درج ذیل مکالمہ ظاہر کرتا ہے کہ عام آدمی بھی بسا اوقات وہ فیصلے کر گزرتا ہے کہ جو اس کی ذاتی بصیرت کی عملی صلاحیت کا مظہر ہوتے ہیں اور یہ ضروری نہیں کہ سب نے فرائیڈ کو پڑھ رکھا ہو۔

''آج ملاقات ہے''

''ایں؟ آج ملاقات ہے؟'' نعیم چونکا۔

''ہاں تمہاری بیوی آئے گی؟''

''پتا نہیں۔ تمہاری؟''

''نہیں میری بیوی اب دوسرے مرد کے ساتھ رہتی ہے۔''
وہ جانے کے لیے مُڑا' پھر رُک کر بولا' ''پہلے ہر سال آیا کرتی تھی۔ ایک دفعہ میں نے پوچھا: ''تمہارے خواہش نہیں ہوتی؟'' کہنے لگی: ''ہوتی ہے''۔ میں نے کہا: ''جاؤ' جس مرد کے ساتھ جی چاہے رہو' مجھے اس کی پروا نہیں۔ اس کے بعد وہ نہیں آئی۔''
کچھ دیر تک وہ وہیں کھڑا ہتھیلی پھیلا کر اس میں دیکھتا رہا۔ ''لیکن کبھی کبھی ۔۔۔۔۔ مجھے یاد آتی ہے۔''۱۹

عبداللہ حسین نے مبصر کردار انیس الرحمٰن کی زبان سے انسانوں کی صورتحال دیکھ کر یہ فتویٰ بھی صادر کرایا ہے کہ مذہب ایک اضافی تراوشِ فکر یا ذہنی تخلیق ہے:

''دُنیا کے تمام مذاہب محبت کا پرچار کرتے ہیں' انہہ پر ہوتا ہے کیا ہے؛ جونہی آپ ایک مذہب کو اپنا لیتے ہیں۔ آپ کے دل میں تعصب کا' نفرت کا بیج بویا جاتا ہے' دوسرے مذہب کے خلاف۔ ان تمام ان گنت فرقوں کے خلاف' جن میں آپ شامل نہیں ہیں محبت کے نام کا پرچار کرنے کے باوجود اس وقت خود بخود ہماری عقل سلب ہو جاتی ہے اور ہم دُنیا کے سب سے مطمئن انسان بن جاتے ہیں۔''۲۰

تجسّس انسانی روح ہمیشہ خدا کی تلاش میں سرگرداں رہتی ہے لیکن عبداللہ حسین کے مبصر کردار کے مطابق انسانوں نے خدا کو خالقِ مطلق کے طور پر شناخت نہیں کیا بلکہ زمان و مکان کے دقیق مسائل سے چھٹکارہ پانے کے لیے خدا نامی ہستی ایجاد کری ہے۔

''جانتے ہو ہم نے خدا کو کیوں ایجاد کیا ہے؟ اپنے آرام کی خاطر' کیونکہ ہم سوچنا نہیں چاہتے اور سچائی کی تلاش میں سوچنا دنیا کا مشکل ترین کام ہے۔ فصل کاٹنے اور بچہ جننے سے زیادہ مشکل۔ ہم سہل پسند ہیں۔''۲۱

نعیم کے کردار کی اضطراری حالت، پرمشقت ذہنی اضطراب، اپنے وجود کے اثبات کی خاطر پرخطر فیصلے اور ان فیصلوں پر عمل درآمد کے حاصل کے طور پر بے پایاں تھکن' اس کے دل میں مسلسل ہلچل مچائے رکھتی ہے۔ بقول اسلوب احمد انصاری:

''انفرادی اور انسانی سطح پر نعیم کو بہرحال اپنی شخصیت اور اپنے وجود کا احساس ہے' گو وہ یہ بھی محسوس کرتا ہے کہ اس کوششِ پیہم کے باوجود جو وہ عذرا سے ہم آہنگ ہونے کے لیے کرتا رہا' وہ پوری طرح کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو سکا۔ اسے بعض اوقات اپنے الگ وجود کا احساس ہوتا ہے' اور وہ کبھی کبھی یہ بھی محسوس کرتا ہے گویا اس کے چاروں طرف ایک خلا چھایا ہوا ہے۔''۲۲

ناول کے اختتام تک نعیم انسان دوستی کی علامت بن چکا ہے۔ وہ آخری لمحوں کی قتل و غارت میں اپنا لکڑی

کا بازو چھپانے کا قصد کرتا ہے کیونکہ وہ لکڑی کا بازو اس کے لیے انسانیت کی زندہ علامت بن چکی ہے۔ اس میں شاید علامتی سطح پر شاید گوشت پوست کے انسان پر طنز بھی پنہاں ہے۔ جہاں نعیم کا آخری منظر دکھایا گیا ہے۔ ہجوم میں اس کی غائب ہوئی پُشت نظر آتی ہے وہ سر جھکائے چل رہا ہے اور چارسو چلتی ہوئی گولیاں اس کے لیے بے معنی ہیں۔ وہ انسانیت کی اس سطح کو چھُو چکا ہے جہاں مکمل غیر جانبداری ممکن ہو جاتی ہے۔ نعیم کی آخری جھلک اس کے آخری نروان کی تصویر ہے کہ۔

> ''آخری دفعہ......ہجوم میں غائب ہوتی ہوئی نعیم کی پُشت نظر آئی...... وہ سر جھکائے چل رہا تھا اور اس نے ایک بار بھی پیچھے مُڑ کر نہ دیکھا، جبکہ گولیاں اس کے تعاقب میں تھیں۔'' [۲۳]

حواشی:

۱۔ Muzzaffar Iqbal, The Chronical of Sad Generations, Karachi: p. 48

۲۔ عبداللہ حسین، اداس نسلیں، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۰ء، ص: ۱۴۹

۳۔ ایضاً، ص: ۲۵۱

۴۔ ایضاً، ص: ۲۴۰

۵۔ ایضاً، ص: ۲۵۰

۶۔ ایضاً، ص: ۲۵۲-۲۵۳

۷۔ ایضاً، ص: ۱۴۳

۸۔ ایضاً، ص: ۱۷۰

۹۔ ایضاً، ص: ۴۸۰

۱۰۔ ایضاً، ص: ۱۳

۱۱۔ ایضاً، ص: ۱۹

۱۲۔ ایضاً، ص: ۳۳۰

۱۳۔ ایضاً، ص: ۱۲۰

۱۴۔ ایضاً، ص: ۳۸۳

۱۵۔ ایضاً، ص: ۳۴۴

۱۶۔ ایضاً، ص: ۱۵۳

۱۷۔ ایضاً،ص: ۱۴۱۔۱۴۲
۱۸۔ ایضاً،ص: ۳۰۲
۱۹۔ ایضاً،ص: ۲۹۸۔۲۹۹
۲۰۔ ایضاً،ص: ۵۳۱
۲۱۔ ایضاً،ص: ۵۳۱
۲۲۔ اسلوب احمد انصاری، اُردو کے پندرہ ناول، علی گڑھ: یونیورسل بک ہاؤس، ۲۰۰۳ء، ص: ۳۲۰
۲۳۔ عبداللہ حسین، اداس نسلیں، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۰ء، ص: ۳۸۳۔۳۸۴

♊